© rasailojaraid.com

اس لیے ہے کہ اقتدار ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک خاندان میں ہی رہے اور کوئی دوسرا فرد اس اعزاز تک نہ پہنچ سکے۔ اگر پرویز الٰہی نہیں ہو گا تو مونس الٰہی آ جائے گا اور اسی طرح اگر شہباز شریف اللہ کو پیارے ہو جائیں گے تو ان کی جگہ پر حمزہ شہباز ان کی گدی پر براجمان ہو جائے گا۔ اگر بھٹو نہیں تو اس کی بیٹی اور اگر بیٹی نہیں تو اس کا بیٹا جماعت کا سربراہ ہو گا۔ اگر باچا خان کے بعد ولی خان آیا تو اس کے بعد ان کے بیٹے نے قیادت سنبھال لی۔ وہ آج اے این پی کے سربراہ ہیں جس کے بعد ان کے بیٹے۔ اور یہ بات سیاسی جماعتوں تک ہی محدود نہیں بلکہ ہمارے ملک کی دینی جماعت جسے سب سے بڑی دینی جماعت کہلانے کا شوق ہے۔ ان کے ہاں بھی یہی سلسلہ چل رہا ہے کہ باپ کے بعد بیٹا باپ کی گدی پر جماعت کی سربراہی کا اعزاز حاصل کیے ہوئے ہیں اور وہ اب اپنے بھائیوں کو بھی سیاست کے میدان میں لے آئے ہیں تا کہ یہ سلسلہ آگے جاری رہے۔ انھیں شاید امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا وہ حکم یاد نہیں کہ جب انھوں نے اپنے بیٹے کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا کہ خلیفہ کے چناؤ کے لیے تو میرا بیٹا رائے دے سکے گا لیکن خود اسے خلیفہ نہیں بنایا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اس کی وجہ بھی بتا دی تھی کہ میں جس سخت امتحان سے گزرا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا بیٹا اس امتحان سے گزرے، خلافت ایک سخت ذمہ داری ہے جس کو پورا کرنا انتہائی مشکل ہے۔

ہمارے ملک کے سیاست دان اسے ذمہ داری نہیں سمجھتے بلکہ منصب تک پہنچنا ان کے ہاں جمہوریت کا بنیادی تقاضا ہے۔ اسی سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام اور جمہوریت میں کیا فرق ہے اسلام میں اقتدار حاصل کرنے کی خواہش کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ لیکن جمہوریت میں اقتدار حاصل کرنا انتہائی ضروری اور لازمی ہے۔ پوری اسمبلی میں اس شق کی مخالفت کرنے والے صرف دو ہی سیاست دان تھے، ایک جاوید ہاشمی اور دوسرے سعد رفیق، باقی سارے مہر بہ لب ہی رہے۔

اب دوسری بات صوبہ سرحد کے نام کی وجہ سے جو صورت حال پیدا ہوئی ہے وہ بھی ان خود غرض سیاست دانوں کی نااہلی اور ان کی سیاسی مفادات کے لیے حرص و ہوس کی نشان دہی کرتی ہے۔ اے این پی کی مرکزی قیادت حکومت کا حصہ ہے۔ زرداری صاحب کی حوصلہ افزائی نے انھیں اپنی پرانی خواہش پختونستان کو عملی جامہ پہنانے پر آمادہ کر لیا وہ پختونستان کا نام تو نہ دے سکے البتہ پختون خواہ کے لیے تیار ہو گئے۔ ن لیگ نے اس پر اعتراض کیا تو پختون خواہ سے ''خیبر پختون خواہ'' ترمیم کا حصہ بن گیا۔ جب قومی اسمبلی نے یہ ترمیم پاس کر دی تو ایبٹ آباد احتجاجی مظاہروں کا مرکز بن گیا۔ ق لیگ نے صورت حال کو ہوا دی اور اس طرح مانسہرہ ہری پور وغیرہ اس احتجاج کی لپیٹ میں آ گئے۔ نوبت احتجاجی مظاہروں پر گولیوں تک پہنچ گئی اس طرح آٹھ دس آدمی اس سیاسی خلفشار کی نذر ہو گئے۔ لیکن معاملہ جوں کا توں ہی ہے۔ اب ملک کے سیاست دان بے چارے پریشان ہیں کہ کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن، ادھر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سینٹ میں ملک کو مزید صوبوں میں تقسیم کرنے کی تجویز آ گئی ہے۔ ایم کیو ایم ایبٹ آباد کے مظاہرین کے حق میں بیان دے رہے ہیں اور اس بات کی تاکید کر رہے ہیں کہ ہزارہ کے نام سے ایک صوبہ اور بنا دیا جائے۔ ادھر پنجاب کے جنوبی حصہ کو علیحدہ کر کے اسے سرائیکی صوبے کی بات ہو رہی ہے۔ لیکن ملک کا دستور اس راہ میں حائل ہے اور کہتا ہے کہ اگر کسی صوبے کی حدود کو تبدیل کرنا ہو تو اس کے لیے اس صوبے کی اسمبلی کی دو تہائی تائید اس کے لیے پہلی ضرورت ہے۔ یہ دو تہائی اکثریت کیسے حاصل ہوگی جبکہ سرحد میں اے این پی کی اکثریت ہے اور پنجاب کے اندر بھی یہی صورت حال ہے کہ پنجاب اسمبلی میں ان کی اکثریت ہے جو پنجاب کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔

یہ صورت حال اس وقت پیدا ہو چکی ہے، اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ لوگوں کے عوامی مسائل دن بدن بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن ان مسائل کو حل کرنے کے لیے حکومت کے پاس سرے سے کوئی وقت ہی نہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جو مسائل عوام کے ہیں ان سے حکمرانوں کو کسی قسم کی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ مطالبہ تو کیا جا رہا ہے کہ ملک کے وزیر اعظم کو امریکہ سے بلا کر ایک آل پارٹی کانفرنس بلائی جائے اور اس میں اٹھارویں ترمیم پر اٹھنے والے اعتراض کا کوئی حل تلاش کیا جائے لیکن یہ کوئی نہیں کہتا کہ ملک کے اندر بجلی کے بحران کو کیسے ختم کیا جائے، مہنگائی کا جو طوفان آ گیا ہے، اس کا کیا علاج ہے۔ بے روزگاری اپنی انتہاء کو پہنچ گئی ہے اس کے تدارک کے لیے کیا کیا جائے۔ پانی دستیاب نہیں ہے اس کا کوئی حل کیسے ممکن ہے۔ یہ مسائل صرف اور صرف عوام کے لیے ہیں۔ سیاست دانوں کے مسائل یہ ہیں کہ صوبہ سرحد کا نام کیا رکھا جائے، سیاسی جماعتوں کے انتخاب نہیں ہو رہے تو لاکھوں، کروڑوں کا گھپلا کیسے ممکن ہے۔ لوٹی ہوئی دولت کی حفاظت کیسے کی جائے۔ بڑے بڑے ادارے کروڑوں اور اربوں روپے کے بجلی کے بل نہیں دے رہے، کوئی انھیں پوچھنے والا نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ایوانِ صدر کے سیکریٹریٹ کے ذمے دو کروڑ بجلی کا بل ابھی تک واجب الادا ہے۔ آزاد کشمیر کی طرح دو ارب روپے کا بجلی کا بل ابھی باقی ہے۔ یہ سب مسائل لاینحل ہوتے جاتے ہیں۔ ان سیاست دانوں کی نااہلی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہے کہ یہ سب مل کر ایک صوبے کا نام ایسا نہیں رکھ سکے جو سب کو قابل قبول ہو۔ اگر تھوڑا سا بھی تفکر کیا جاتا تو ''خیبر پختونخواہ'' کی جگہ ''ہزارہ پختونخواہ'' بھی رکھا جا سکتا تھا۔ لیکن ایسا اس لیے نہ ہوا کہ نیت میں فتور ہے اور یہ نیت کا فتور اس وقت تک رہے گا۔ جب تک اقتدار پر براجمان رہنے کی ہوس ختم نہیں ہوتی اور یہ ہوس تو اس وقت ہی ختم ہوگی جب دین کی طرف ہم لوٹ آئیں گے اور ہمیں عیش و عشرت کی بجائے آخرت کی فکر لاحق ہوگی، آخری بات یہی ہے

نیت کا فتور ہے کہ ہم نامراد ہیں
شہ رگ سے ورنہ خدا کتنی دور ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امتیازی قوانین کا خاتمہ مطلوب ہے!

عبدالرشید ارشد

امتیازی قوانین کیا ہیں اور یہ کن عدود تک جاتے ہیں مختلف قومیتوں اور مختلف مذاہب کے نزدیک ان کی تعبیر و تشریح مختلف ہے۔ ایک قانون اگر ایک مذہب کی ضرورت سمجھا جاتا ہے تو دوسرا مذہب اپنے تحفظات کی پٹاری کھول لیتا ہے۔ اس ضمن میں ہر دوسرے مذہب کی بحیثیت کے تحفظات زیادہ ہیں مگر ستم یہ ہے کہ وہ دوسروں کے تحفظات کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہم اپنی بات کا آغاز جاوید نذیر صاحب کے مضمون ''امتیازی قوانین کا خاتمہ'' مطبوعہ نوائے انسان شمارہ نومبر کے اقتباس سے کرتے ہیں:

> ''۱۹۴۹ء میں قرارداد مقاصد کی منظوری کے بعد اداراتی سطح پر مذہب کے عمل دخل کے سلسلے کا آغاز ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد پاکستان کے پہلے آئین میں ملک کو سرکاری طور پر اسلامی جمہوریہ قرار دے کر غیر مسلم پر قدغن لگا دی گئی کہ وہ ملک کے صدر اور وزیر اعظم کا عہدہ نہیں سنبھال سکتا۔ ۱۹۵۶ء میں ہی اسلامی نظریاتی کونسل تشکیل دے کر اس سوچ کو پروان چڑھانے کی کوشش کا آغاز کیا کہ یہ ملک مذہب کے نام پر حاصل کیا گیا تھا''(بحوالہ ''نوائے انسان'' نومبر ۰۹، صفحہ ۱۳)

مذکورہ اقتباس میں دو سوال پنہاں ہیں، دو نقاط جواب طلب ہیں۔ پہلا یہ کہ ''ملک مذہب کے نام پر حاصل کیا گیا تھا'' دوسرا یہ کہ ''غیر مسلم پر قدغن لگا دی گئی تھی کہ وہ ملک کے صدر اور وزیر اعظم کا عہدہ نہیں سنبھال سکتے۔'' ہم اپنی بات آگے بڑھانے سے قبل ان دو نقاط کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ ہماری گذارشات کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ پہلے سوال میں یہ فیصلہ ہونا ضروری ہے کہ کیا پاکستان کے مذہب کے نام پر حصول کا فیصلہ ۱۹۴۹ء میں ہوا تھا یا تخلیق پاکستان سے دس بارہ سال قبل یہ طے ہو چکا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے:

> ''اس قوم کو ایک جداگانہ گھر کی ضرورت ہے۔ ان دس کروڑ مسلمانوں کو جو اپنی تمدنی معاشرتی صلاحیتوں کو اسلامی خطوط پر ترقی دینا چاہتے ہیں ایک اسلامی ریاست کی ضرورت ہے۔''
>
> ''ایک آزاد اسلامی سلطنت کے بغیر اسلام کا تصور ہی باطل ہے۔ مسلمان کے نزدیک صحیح آزادی کا تصور یہ ہے کہ وہ ایسی اسلامی حکومت کو معرضِ وجود لائے جو قرآن کریم کے ضابطہ خداوندی کی متشکل ہو...... مسلمان کے نزدیک ہر وہ نظام باطل ہے جو کسی انسان کا وضع کردہ ہو کیونکہ اس کے پاس ایک محکم دستور ہے جو اس کی ہر موقع پر اور ہر زمانہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں رہنمائی کرسکتا ہے۔''

ہمیں یقین ہے کہ بانی پاکستان کے ۱۹۴۰ء کے اعلان سے یہ فیصلہ کہ ہمیں مذہب کی بنیاد پر ایک آزاد مملکت چاہیے اور مذہب بھی خالصتاً قرآن وسنت کی بنیاد کے ساتھ، جناب جاوید نذیر صاحب کا مغالطہ دور ہو جانا چاہیے کہ پاکستان کو ۱۹۴۹ء میں مذہب سے منسوب کیا گیا۔ جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل نے غیر مسلم صدر اور وزیر اعظم کے لیے راستہ بند کر دیا، ہم جاوید نذیر صاحب سے ہی بصد احترام یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، روس، چین، جاپان، سویڈن، ڈنمارک، ناروے اور آسٹریلیا میں جو مہذب، آزاد خیال اور نہ جانے کیا کیا کچھ ہیں کیا وہاں کبھی کوئی مسلمان سربراہِ مملکت یا وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز رہا۔ وہاں بھی مسلمان آباد ہیں، ووٹر ہیں، ان کے کچھ حقوق بھی ہوں گے۔ لبنان میں مسلمان اور عیسائی کم وبیش برابر بستے ہیں وہاں صدر مسیحی ہونا لازم ہے۔ پاکستان میں ۹۸ فیصد سے زائد مسلمان آبادی ہے۔ ملک مذہب کے نام پر لیا گیا یہاں اعتراض کا کیا جواز ہے؟

جاوید نذیر صاحب کو اصل اعتراض تو یہ ہے یا وہ کہنا چاہتے ہیں کہ پاکستان میں ''امتیازی قوانین'' کے سبب مسیحی اقلیت ظلم کا شکار ہے۔ اپنے اعتراض کے ضمن میں وہ تائیدی حوالہ سامنے لاتے ہیں کہ:

> ''قومی کمشن برائے انصاف (این سی جے پی) کے اعداد وشمار کے مطابق ۱۹۸۶ء سے ۲۰۰۹ء تک توہین مذہب کے مقدمات میں ۹۶۰ افراد کو ملوث کیا گیا۔ ان میں سے ۴۷۷ کا تعلق مذہب اسلام سے تھا، ۳۴۰ احمدی شہری تھی، مسیحی ۱۱۸، ہندو ۱۰ جب کہ ۱۰ کا عقیدہ نامعلوم تھا۔ ۳۲ افراد کو ماورائے عدالت قتل کیا گیا۔'' (نوائے انسان، صفحہ ۱۵)

مذکورہ اقتباس سے غیر مسلموں سے امتیازی سلوک کا ثبوت پیش نہیں کرتا کہ جس اسلام نے ۹۶۰ میں سے ۴۷۷ مسلمانوں کو ان کے خلاف اسلام کے سبب نظر انداز نہیں کیا اور باز پرس کی اس کے متعلق کیا عقلِ سلیم تسلیم کرتی ہے کہ اسے امتیازی سلوک کا طعنہ دیا جائے؟ ۹۶۰ میں سے صرف ۱۱۸ مسیحی تھے جنھوں نے اسلامی مملکت میں اکثریتی مذہب کی توہین کی تو سزا کے مستحق قرار پائے۔ کیا اسی کا نام امتیازی سلوک ہے؟ مسیحی برادری کی وکالت کا حق ادا کرتے جاوید نذیر صاحب جو خود بھی مسیحی ہیں مگر طے شدہ پالیسی کے مطابق نام مسلمانوں سے مشابہت والا ہے، بڑی دور کی کوڑی لاتے ہیں کہ:

> ''ایک طرف تو مسیحی ہیروز دشمن سے جنگ لڑ رہے تھے تو دوسری طرف مسیحیوں کو دشمن کا ایجنٹ بھی کہا جاتا تھا۔ بالکل اسی طرح سانحہ گوجرہ کے بعد مذہبی جماعتوں نے کہا کہ سانحہ گوجرہ عیسائیوں نے خود کیا تا کہ توہین مذہب کے قوانین کو ختم کرنے کے لیے موثر جواز پیدا کیا جا سکے......'' (نوائے انسان، نومبر ۲۰۰۹، صفحہ ۱۵)

۱۹۶۵ء کی پاک بھارت سترہ روزہ جنگ میں بطور سٹاف آفیسر ہم خود شریک تھے۔ قصور سیکٹر میں ہونے کے سبب کچھ واقعات سے متعلق ہمیں بھی علم ہے۔ ہم مسیحی پائلٹ میسل چودھری کی حب الوطنی اور پاکستان کے لیے قربانی کے

© rasailojaraid.com